مولانا غلام رسول مہر

میرزا غالب نقّاد کی حیثیت سے

تنقید کا مطلب ہے جانچنا اور پرکھنا۔ اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی علمی یا ادبی مرقع یا اس کے کسی جزو کی اچھائی برائی اور حُسن و قبح کو خوب دقّتِ نظر سے جانچا اور پرکھا جائے۔ عبارت، اسلوبِ بیان اور ترتیب و تشریحِ مطالب کا اندازہ کرتے ہوئے کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دیا جائے۔

میرزا غالب کی صلاحیتِ نقد و نظر پر گفت گو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند باتیں بطور تمہید عرض کر دی جائیں۔ مثلاً میرزا کے زمانے میں فنِ تنقید ارتقا کے اس درجے پر نہیں پہنچا تھا جس پر یہ آجکل پہنچا ہوا ہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ آزادانہ اور حق شناسانہ جائزوں کا طریقہ ہی بڑی حد تک مفقود تھا یا تو تقریظیں لکھی جاتی تھیں جو مصنف، کتاب اور اس کے نفسِ مضمون کے بارے میں نہایت عجیب و غریب اور ایک حد تک مضحکہ خیز تحسین و ستائش سے لبریز ہوتی تھیں یا مخالفین تعریضات کی برچھیاں اور تلواریں لے کر صاحبِ تصنیف پر یورش بول دیتے تھے اور کتاب کی اچھائیوں سے یا تو بالکل قطعِ نظر کر لیتے تھے یا پھر ان اچھائیوں کو بھی برائیوں کا جامہ پہنا کر منظرِ عام پر پیش کرتے رہتے تھے۔ میرزا کی تصانیف میں تقریظیں بھی موجود ہیں اور "قاطع برہان" کی اشاعت سے تا دمِ مرگ انھیں زہرِ تعریضات کے جام بھی پے بہ پے پینے پڑے۔

نفسِ صحت اور حُسنِ کلام

ادبیات میں تنقید کے لیے صرف وسعتِ معلومات کافی نہیں۔ معلومات کے علاوہ نقاد کے لیے صاحبِ ذوق ہونا بھی ضروری ہے اور ذوق کا درجہ جتنا بلند ہوگا اتنا ہی اس کا معیارِ تنقید بلند ہوگا۔ تنہا وسعتِ معلومات کی بنا پر ہم یہ تو جان سکتے ہیں کہ فلاں چیز صحیح ہے یا نہیں ہے لیکن ادبیات میں حسن کا درجہ نفسِ صحت سے بالاتر ہے یعنی یہ کہ صحیح چیز ٹھیک اپنے موقع اور

محل پر استعمال ہوئی یا نہیں۔ نظم و نثر میں کئی ایسی چیزیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں جن کی صحت میں کسی کو کلام کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ قواعد زبان اور لغت کی رُو سے ان پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی لیکن ضروری نہیں کہ معیارِ ذوق کی ترازو میں بھی وہ پوری اترتی ہوں۔

میرزا غالب کی فارسی اور اردو نظم و نثر میں پیشِ نظر موضوع کے متعلق بہ کثرت سامان موجود ہے بعض کتابیں تو بائے بسم اللہ سے تائے تحت تک تنقید ہی کے تحت آتی ہیں۔ مثلاً "قاطع برہان"۔ "لطائف غیبی"۔ "سوالات عبدالکریم" اور "تیغ تیز"۔ لیکن ان تصانیف کا جائزہ لینے کی شکل یہی ہے کہ سب سے پہلے ان سے مفصل اقتباسات پیش کیے جائیں جن پر میرزا غالب نے یہ تنقیدی کتابیں لکھیں۔ پھر میرزا کی کتابوں سے مختلف ٹکڑے سنا کر موازنہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ حق بجانب کون ہے۔ اس کے بغیر میرزا کی شانِ تنقید واضح نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس قسم کی تفصیلات اس سرسری گفتگو کے دائرے سے خارج ہیں۔ لہٰذا میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی حیثیت محض اشاروں کی ہوگی۔ امید ہے کہ اس طرح بھی نقادی کے اس جوہر کی چہرہ کشائی کا بندوبست ایک حد تک ضرور ہو جائے گا جو قدرت نے میرزا کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا۔

میرزا کا کارنامہ

میرزا جس ماحول میں پیدا ہوئے، جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی اور علم حاصل کیا، جس ماحول میں ان کی مشقِ سخن کا آغاز ہوا اس کے مروجات اور معمولات سے وہ یک قلم آزاد و بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے تاہم انھوں نے جس طرح اپنے نادر اسلوبِ فکر سے دورِ قدیم اور دورِ جدید میں برزخ کا مقام پیدا کیا۔ اسی طرح تنقید میں بھی ان کو برزخ ہی کا مرتبہ حاصل ہے۔ یعنی پچھلوں سے کامل قطع تعلق نہ کرتے ہوئے آنے والوں کے لیے نئے راستے پیدا کیے اور اپنی انقلاب آفریں فطرت سے کام لے کر جدید دور کی بنیادیں استوار فرمائیں۔ یہ ان کی نقاد طبیعت اور ان کے ذوقِ سلیم کا کرشمہ تھا کہ اپنے عہد کے ادبی عیوب کا انھیں بہت جلد پورا احساس ہو گیا اور پھر ان عیوب سے نہ محض خود جلد از جلد کنارہ کش ہو گئے بلکہ دوسروں کو بھی کنارہ کشی کی مؤثر دعوت دی نقادانِ فن کی خدمت میں غالباً یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ادبیات کو جس نہج پر

میرزا نے ڈالا تھا یہ آج تک اسی نہج پر جاری ہیں۔

تحریر کے بنیادی اصول

"پنج آہنگ" کا دیباچہ میرزا نے اس زمانے میں لکھا تھا جب وہ جوانی کے ابتدائی مراحل میں تھے اس میں خطوط نویسی کے جو اصول و معانی پیش کیے ہیں انھیں سامنے رکھ کر غور فرمائیں گے تو صاف آشکار ہو جائے گا کہ یہ انیسویں صدی کے عشرۂ ثالثہ کی صدا نہیں جب کہ ہر بات کو زیادہ سے زیادہ پیچ دار کہنا لازمہ علم و فضل سمجھا جاتا تھا۔ یہ بیسویں صدی عیسوی کی صدا ہے جب کہ تکلفات کو سراسر لغو و لایعنی سمجھا جاتا ہے۔

میرزا کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ نامہ نگار کو چاہیے کہ نگارش کو مقصود سے زیادہ دُور نہ لے جائے۔ اور تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا کرے۔

۲۔ نفسِ مطلب کو ایسے انداز میں قلم بند کرے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

۳۔ اگر نامہ نگار کے سامنے زیادہ مطالب ہوں تو تمام مطالب کو انتہائی احتیاط سے جدا جدا بیان کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سب خلط ملط ہو جائیں اور پڑھنے والے کے لیے الجھن کا باعث بنیں۔

۴۔ نامانوس الفاظ اور دقیق استعارات سے عبارت کو پاک رکھا جائے۔ حتی الامکان تحریر کو طول نہ دیا جائے۔

۵۔ لطفِ تحریر کا تقاضا یہ ہے کہ ایک لفظ بار بار استعمال نہ کیا جائے۔

۶۔ زبان کی خوبی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ لکھنے والے کو پوری کوشش کرنی چاہیے۔ کہ سادگی اور لطافت اس کی عادت بن جائے۔

کیا یہ روشن ہدایتیں صرف وسعتِ معلومات سے پیدا ہو سکتی ہیں؟ میرزا سے پہلے بھی بڑے بڑے عالم گذر چکے تھے اور ان کے زمانے میں بھی یگانۂ روزگار فاضلوں کی کمی نہ تھی لیکن ایسی باتیں صرف علم سے نہیں بلکہ علم کے علاوہ حسن ذوق، کمال جدتِ نظر، دقتِ اجتہاد اور مشق و مزاولت سے پیدا ہوتی ہیں۔ نامہ نگاری کے یہی روشن اصول تھے جو میرزا کے اردو مکاتیب میں

بوجہ احسن استعمال ہوئے اور اُن کے مکاتیب کو وہ درجہ کمال حاصل ہوا کہ ایک صدی گذر جانے پر بھی وہ اردو زبان میں بے مثال ہیں۔

"معارف" اعظم گڑھ نے خوب لکھا ہے :

اُردو نثر کا انھوں نے ایسا دلکش اسلوب پیدا کیا جس نے اس کا طرز ہی بدل دیا۔ اردو شاعری میں تو جزوی طور پر ان کے شریک و سہیم بھی نکل سکے ہیں لیکن نثر میں وہ منفرد ہیں ان کی نثر کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔

میرزا کی تقریظیں

میرزا نے بھی اگرچہ اپنے دوستوں کی فرمائشوں پر پُرانے انداز میں چند تقریظیں لکھیں لیکن وہ اپنے طریق فکر و نظر کو کاملاً نہ بدل سکے اور اپنا خاص مجتہدانہ نقطہ نظر نہ چھوڑ سکے۔ ان کے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنے دیوان کا دیباچہ لکھوایا۔ میرزا عام رواج کے مطابق تفتہ کی مدح میں پھیلاؤ سے کام نہ لے سکے۔ یہ امر غالباً تفتہ کے لیے شکایت کا موجب بنا۔ دیکھیے میرزا جواب میں کیا فرماتے ہیں :

"کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ میرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کا دیباچہ دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوانِ حافظ کی بہ موجب فرمائش "جان جاکوب بہادر" کے لکھی ہے، اس دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح سرائی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔ واللہ باللہ! کسی شہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھنا تو اس کی مدح اتنی نہ کرنا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح بہت جانتے۔"

یہ نقد و فکر اور حقایق رس نگاہ تھی جس نے میرزا کو پُرانی روش سے ہٹا کر نئی راہ پر ڈالا۔

وش ہے جو ادبیات میں وجہ افتخار مانی جاتی ہے۔ یہی نقاد فکر اور حقائق رس نگاہ تھی جس نے شاعری میں میرزا کے اسلوب بیان کو شانِ امتیاز بخشی۔ وہ بالکل سچ کہتا ہے :

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ایک اہم واقعہ

مولانا فضل حق خیرآبادی میرزا کے عزیز ترہ دوست تھے۔ جب ان میں اور شاہ اسمٰعیل میں مسئلہ امکان نظیر و امتناع نظیر پہ بحث چھڑی تو مولانا فضل حق نے اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید میں میرزا سے ایک مثنوی لکھوائی جو اُن کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہے لیکن میرزا کی نقاد طبیعت مولانا کے بتائے ہوئے نظریہ کو قبول نہ کر سکی اور انھوں نے مثنوی کے آخر میں صاف کہہ دیا۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃٌ للعالمینی ہم بود

یہ بات مولانا فضل حق کی رائے کے مطابق نہ تھی، اس پر وہ بہت بگڑے۔ میرزا نے ان کی دلداری کے لیے مثنوی میں چند شعر بڑھا کر اپنی اس بات کی تغلیط کر دی۔

آئین اکبری کی تقریظ

سر سید احمد خان مرحوم نے بڑی محنت سے ابوالفضل کی آئین اکبری کی تصحیح فرمائی۔ اسے چھپواتے وقت میرزا کی نقاد طبیعت ریائی مدح و ستائش کے لیے طیار نہ ہو سکی۔ وہ انگریزوں کے عہد کے ایجادات سے بہت متاثر تھے اور اکبر کے زمانے کے آئین کو تقویم پارینہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا بے تکلف ان چیزوں کو سراہنے لگے جو انگریزوں کے ذریعے سے اس ملک میں پہنچی تھیں۔ مثلاً پتھر کو پتھر پر رگڑ کر آگ سلگانے کی بجائے دیا سلائی سے کام لینا۔ بھاپ سے جہاز اور ریل گاڑی چلانا۔ تار برقی کے ذریعہ سے دُور دور کی خبریں لمحہ بھر میں منگا لینا۔

فرماتے ہیں :

آتشے کز سنگ بیروں آورند ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند

تا چہ افسوں خواندہ اندانیاں بر آب
دُودِ کشتی را ہمی رانند در آب

گرد خاں کشتی بہ جیحوں می بُرد
گرد خاں گردوں بر آموں می بُرد

نغمہ ہائے زخمہ از ساز آوَرند
حرف چوں طائر بہ پرواز آوَرند

ایں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد کروہ

آخر میں سر سید کے پاس خاطر سے کہتے ہیں :

غالبؔ آئینِ خموشی دل کش است
گرچہ خوش گفتی نہ گفتن ہم خوش است

در جہاں سید پرستی دینِ تست
از ثنا بگزر، دعا آئینِ تست

ایں سراپا فرہ فرہنگ را
سید احمد خانِ عارف جنگ را

ہر چہ خواہد از خدا موجود باد
پیش کارش طالعِ مسعود باد

عُرفی کا ایک شعر

اب میرزا کی نقادی کی ایک دو مثالیں اردو میں بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ عرفی کے حمد والے قصیدہ کا مشہور شعر ہے :

من کہ باشم عقلِ کُل را ناوک اندازِ ادب
مرغ اوصاف تو از اوجِ بیان انداختہ

عام شارحین اس کی جو شرح فرماتے ہیں وہ خود میرزا کی زبان سے سنیئے۔ فرماتے ہیں :

اس کی جو شرح چھاپے میں لکھی ہے اس کو ملاحظہ کیجیے اور معانی میرے خاطر نشاں کیجیے تو میں سلام کروں۔ پہلے نظر یہاں لڑانی چاہیے کہ "از اوج بیان انداختہ" کا فاعل کون ہے اور مفعول کون ہے۔ اگر "عقل کل" کو "انداختہ" کا مفعول اور "منکہ" کے کاف کو کدامیہ ٹھہراؤ گے تو بے شبہ "انداختہ" کے فاعل دو ٹھہریں گے۔ ایک "ناوک انداز ادب" اور ایک "مرغ اوصاف تو" ایک فعل اور دو فاعل، یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق ہے ؟

مروجہ شرح پر تنقید کے بعد خود یوں معنی بیان کرتے ہیں :

"من انداختہ" کا مفعول "را" مقدر، "منکہ" کا "کاف" توصیفی، "ناوک انداز ادب

ادب آموز یعنی استاد۔ "مرغ توصیف تو" فاعل۔ مجھ کو کہ عقل کل کا استاد ہوں۔ تیرے مرغ توصیف نے اوج بیان سے گرایا۔ "عقل کل" تک کہ وہ علویوں سے اعلیٰ ہے اس کا ناوک پہنچ سکتا تھا۔ مگر مرغ اوصاف اس مقام پر ہے جہاں اس "ناوک انداز" کو ناوک کے پہنچانے کی گنجایش نہیں۔ اوجِ بیان سے گرنا عاجز آجانا ہے۔ قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ اوجِ بیان سے گر گیا۔ کیا اچھا مبالغہ ہے مرغ اوصاف کی بلندی کا اور کیا مضمون ہے اظہار عجز باوجود دعوائے قدرت۔

ظہوری کا ایک شعر

ظہوری کا ایک شعر ہے:

مروت کرد شبہا بر تو سیر بام و در لازم
نمی باشد چراغ خانہ ہائے بے نوایاں را

اس کا عام مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ تو مروت سے کام لے کر راتوں کے اندھیرے میں کوٹھے پر چڑھ کر دیکھے تو معلوم ہو جائے کہ بے نواؤں کے گھروں میں ایک دیا تک موجود نہیں اب میرزا سے اس شعر کی شرح سنیئے پھر اندازہ فرمائیے کہ مرزا کیوں ظہوری کو "روح روان معنی" کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ظہوری کا ممدوح اور معشوق ایک ہے یعنی سلطان جلیل القدر ابراہیم عادل شاہ۔ بادشاہوں کے منظر بلند ہوتے ہیں اور کیا بعید ہے کہ رعایا اور ملازمین میں سے کچھ لوگ زیر قصر رہتے ہوں۔ اس واسطے بادشاہ دن کو اس منظر بلند پر نہیں چڑھتا کہ مبادا رعیت یا ملازموں کی جورو بیٹیاں نظر آئیں رات کو ان کے گھر تاریک ہوتے ہیں، اگر کوئی بلند مقام پر چڑھا تو کچھ نظر نہیں آئے گا۔ یہ مدح ہوئی عفت کی۔ اب ابہام کی سوچیئے۔ ممدوح نے راتوں کو کوٹھے پر چڑھنا اپنے اوپر لازم کیا۔ اس واسطے کہ (بے نواؤں کے) گھروں میں چراغ نہیں۔ اگر کسی کپڑے میں پیوند لگانا یا چمڑے کی کوئی چیز گانٹھنی یا کسی مریض کا تفحص حال منظور ہو تو وہ گھر اس ممدوح کے پرتو جمال سے منور ہو جائے۔ چراغ کی حاجت باقی نہ رہے۔..... مروت کا فرہ وجدانی ہے۔ سوا اس لفظ کے کوئی لفظ کام نہیں آتا۔ اگر حفظ ناموس رعایا ہے تو مروت ہے۔ اگر مفلسوں کی کاربرآری

ہے تو مروّت ہے۔

اصل نقادی یہی ہے کہ نگاہ ایک ایک لفظ میں پھرے اور معلوم کرے کہ وہ کس غرض سے شعر میں لایا گیا اور مضمون شعر کی ترکیب و توضیح میں اس کا مقام اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ یہ میرزا کی شان نقادی کی محض ایک جھلک تھی۔ اس بارے میں تفصیلی گفتگو کے لیے نئی صحبت درکار ہے۔

مسلمانوں کے عقائد و افکار

علامہ ابوالحسن اشعری ترجمہ: مولانا محمد حنیف ندوی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے جلیل القدر عالم علامہ ابوالحسن اشعری کے شاہکار مقالات الاسلامیین کا ترجمہ ہے۔ اس میں علامہ نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے ان تمام عقائد و افکار کو بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے جو صدیوں ہمارے ہاں فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے۔ اس کے مطالعے سے جہاں یہ معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے نفسیات، اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کی تخلیق کی ہے وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو برقرار رکھا ہے۔ قیمت : ۹ روپے

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور